حیاتِ قادر

مؤلف

عبید اللہ دُرّانی

باب نمبر ۸

حُجرۃ مُبارک ۱۹۲۵ء

ایک خادم جو فقیری میں شہنشاہیت کے تماشے دیکھ چکا ہے بیان کرتا ہے کہ بابا قادر کے دربار میں دن کا یہ رنگ تھا کہ گانے ہو رہے ہیں اور قوالیاں۔ یا پھر ایک ہی قطار میں چھوٹے بڑے، امیر و غریب کھڑے ہو کر ایک ایک کر کے بابا صاحب کی زیارت کو آتے ہیں۔ اپنا دُکھڑا سُنا کے فیضیات ہو کر چلے جاتے ہیں۔ اور رات کا رنگ اس سے بھیسوا۔ جب یہ خادم رات کو پڑ کر سو رہتے تو وہ بشارتیں ہوتیں جو برسوں کی چلہ کشی اور گوشہ نشینی سے بھی نصیب نہیں ہوتیں۔ بس دمادم ان کا ایسا فیضان تھا کہ اللہ اللہ۔

اسی خادم نے بتایا کہ بابا صاحب ایک بار دربار میں تشریف رکھتے تھے آپ نے ایک دوسرے خادم کو حکم دیا کہ مجھ کو حجرہ دکھا دیا جائے۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔ جب دروازہ کھولا گیا اور میں نے حجرہ کے اندر قدم رکھ کر آنکھیں اُٹھائیں تو دیواروں پر جگہ جگہ تختیاں سی لگی ہوئی نظر آئیں جن پر عرب خط میں قرآن کریم کی آئتیں لکھی ہوئی تھیں۔ وہ تختیاں اس قدر مجلا تھیں اور اتنی پُرنور کہ ان کا پڑھنا مشکل تھا۔ یہ منظر عجیب ایک چمک دکھا کر غائب نہیں ہوا بلکہ بڑی دیر تک میری آنکھیں کھلی رہیں اور میرے چاروں طرف یہی منظر رہا۔ اس خادم کے علاوہ بہت سے ہندو اصحاب جو وہاں اکثر آیا جاتا کرتے تھے، بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی یہ منظر دیکھا ہے۔ اس قسم کے مناظر بزرگانِ دین کے چلوں کے مقامات میں اکثر خوش نصیب لوگوں کو نظر آتے ہیں۔ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے چلہ کا حجرہ۔ داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کے قریب لاہور میں ہے۔ اور اہلِ باطن کے لئے اسی قسم کے مناظر اور مظاہر رکھتا ہے۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ دل کے ذکر کی بازگشت ان دیواروں پر قائم ہو جاتی ہے۔ اور حجرہ کی مٹی کی دیواریں بھی مجلیٰ اور منور ہو جاتی ہیں۔ اور جو لوگ صفائے قلب کے ساتھ داخل ہوتے ہیں انہیں یہ منظر دکھائی دیے جاتے ہیں۔

اس حجرۂ مبارک کید استان یوں ہے کہ ۱۹۲۵ء میں خادموں کو یہ خیال آیا کہ اس چٹان پر جھونپڑی کا قائم رہنا دشوار ہے۔ اگر چار کونوں میں پتھر کے اندر سوراخ کر دیئے جائیں اور ان میں چار کھمبے لگا دیئے جائیں تو جھونپڑی قائم رہ سکتی ہے اس خیال کے تحت آس پاس کی پہاڑیوں پر کام کرنے والے سنگتراشوں کو بلایا گیا اور انہوں نے نجوشی اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ جب سوراخ کرنے کا کام ختم ہو گیا تو ان سنگتراشوں نے خود ہی کہا کہ بجائے لکڑی کے کھمبوں کے ہم ان ہی چٹانوں میں پتھر کے چار کھمبے بنا کر لگا

دیں گے اور ایسا ہی کیا گیا۔ جب کھمبے لگ گئے تو ان ہی لوگوں نے پتھر کی دیواریں کھڑی کر دیں اور ایک دوسرے شخص نے گنبد نما چھت ڈال دی اور کواڑ لگوا دیے۔ پھر فرش ہموار کر کے پختہ کرا دیا۔ نہ کوئی نقشہ تھا نہ پیسہ اور نہ ہی کوئی فرمائش و خواہش۔ یہ سب خود بخود ایسے ہی ہوتا گیا جیسے جنگل میں خود بخود پھول نکل آتے ہیں اللہ والوں کے کام کچھ اس طرح ہوتے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء تک بابا صاحب رات کا وقت اپنے آبائی مکان کے کھلے صحن میں جہاں جھونپڑی ڈال رکھی تھی گزارا کرتے اور دن جنگل کے اسی حجرے میں۔ سنہ ۱۹۲۳ء کے طوفانِ عظیم کے بعد سے بابا صاحب کی شہرت بہت تیزی سے پھیل گئی تھی اور یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ فقیر جو کمبل روڈ کے کالے تالاب کے نزدیک چٹانوں پر رہتا ہے مہلک سے مہلک بیماری کا دم بھر میں علاج کر دیتا ہے۔ اس شہرت کی وجہ سے دُور دُور سے لوگ آنے لگے۔ معمول یہ رہتا کہ جب کافی لوگ جمع ہو جاتے تو بابا صاحب کو حجرہ میں اطلاع کر دی جاتی۔ وہ اگر جی چاہتا تو باہر آ جاتے اور کسی کو کوئی پتّی دے دیتے۔ کسی کو ایک چٹکی راکھ۔ لوگ اپنی مرضوں کا یہ علاج لے کر خوش خوش واپس لوٹ جاتے۔ ان ہی لوگوں میں اکثر انگریز حکام اور تجارتی کمپنیوں کے افسر بھی دُور دُور سے آتے اور اپنی مرادیں پا کر لوٹ جاتے۔

سنہ ۱۹۳۱ء سے بابا صاحب نے اس حجرۂ مبارک میں مستقل قیام شروع کر دیا اور ان ہی چٹانوں کے نیچے کی طرف تھوڑے سے فاصلہ پر ایک اور جھونپڑی بنائی گئی جس میں کبھی کبھی غسل کے لئے پانی گرم ہوتا تھا۔ یا چائے وغیرہ بنتی تھی۔ اب دو چار خادموں نے بھی یہاں مستقل رہنا شروع کر دیا تھا جن میں قابلِ ذکر مرحوم امام صاحب تنالی والے ہیں اور فرید بابا جو آج کل مچھلی ٹیم میں پوری فقیری لئے بیٹھے ہیں۔ یہ خادم لوگ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور جتنا بھی وقت ملتا اس جگہ کے درست کرنے میں صرف کرتے۔ ان لوگوں نے جھاڑ جھنکار کاٹ کر گڑھوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے مٹی سے بھر ڈالا۔ اللہ رہے ہمت چٹانوں کے درمیان کے وہ بڑے بڑے گڑھے جو پندرہ پندرہ بیس بیس فٹ گہرے تھے آج ہموار ہو چکے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں چمڑے کے ایک تاجر دیوالیہ ہو کر بابا صاحب کے پاس آئے اور بابا صاحب کی خدمت میں روزانہ حاضری دینے لگے۔ بابا صاحب ان سے فرمادیا کرتے کہ آج فلاں مال خرید لو اور کسی دن کہتے آج اپنا سب مال فروخت کر دو۔ بظاہر تو یہ روزمرہ کی عقل اور سمجھ کی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ مگر یہ بابا صاحب کا فیض تھا کہ دو تین سال کے اندر وہ تاجر کافی مال دار اور صاحبِ جائداد ہو گئے اور انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ زائرین کی سہولت کے لئے اگر اجازت ہو تو وہ ایک بڑا چبوترا اور اس پر ایک چھپر ڈلوا دیں۔ بابا صاحب نے اس بات کو منظور کر لیا اور حجرۂ مبارک سے متصل زمین ہموار کر کے ساٹھ فٹ لمبا اور تیس فٹ چوڑا ایک چبوترا بنا دیا گیا۔ پھر اینٹ کے ستون پر تاڑ کا شہتیر رکھ کر ایک اچھا خاصا محفل خانہ تیار ہو گیا۔ اس کے بعد اور بہت سی پختہ عمارتیں بننے لگیں۔

کچھ لوگوں نے بہت چاہا کہ محفل خانہ کو پختہ کر دیں مگر بابا صاحب نے اس کی منظوری نہیں دی۔ یہاں تک کہ اس فرش کو جو دبیز ریت کا ہے اسی حالت میں رکھنے کا حکم دیا۔ آپ نے یہ فرمایا "مٹی کا فرش بیٹھنے کے لئے اور سر پر پتوں کا سایہ بہت اچھا ہے۔" ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۸ء تک پوری تیئس سال حجرہ کی یہی حالت دیکھی گئی۔ اس حجرہ کا دروازہ جنوب کی طرف کھلتا ہے۔ اندر داخل ہوں تو سیدھے ہاتھ کی طرف ایک چارپائی پڑی ہوئی ہے جس کی نواڑ اور دری وہی ہے جو ۱۹۲۵ء میں کسی نے ڈال دی تھی۔ دروازہ کے مقابل شمال کی دیوار سے ملا ہوا ایک لمبا چبوترہ ہے جس کا رُخ مشرق سے مغرب کی طرف ہے۔ چبوترہ اور چارپائی کے درمیان تھوڑی سی جگہ اور ہے جس میں اگر چارپائی ڈال دی جائے تو کمرہ بالکل پُر ہو جاتا ہے۔ بابا صاحب نے تیئس سال کی مدت کا زیادہ حصہ اسی چبوترہ پر بیٹھ کر گزارا ہے۔ یا پھر جب بھی مہلت ملی ہے تو حجرہ میں جا بیٹھے ہیں۔ اس حجرہ میں آپ قبلہ رُو ہو کر ہاتھ میں صندل کی تسبیح لے کر بیٹھ جاتے تھے۔ یہ تسبیح اب اتنی گھِس چکی ہے کہ چمکتی ہے۔ سامنے کچھ پھول پڑے رہتے ہیں اور بائیں ہاتھ پر کونے میں عود دان جلتا رہتا ہے۔

سنہ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۸ء تک عجب زمانہ گزرا ہے۔ ریاضت کس چیز کو کہتے ہیں۔ اس کا سمجھنا اور سمجھانا بڑا دشوار ہے۔ ظاہری ریاضت تو یہ ہے کہ مٹھی بھر چنے یا ایک پیالی چائے یا اس سے بھی کم پر اکتفا کیا جائے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سے زیادہ سویا نہ جائے اور سارا وقت گوشہ نشین ہو کر ذکر و فکر میں گزارا جائے۔ یہ طریقہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے اور ایسا ہوتا بھی ہے مگر سُنا ہے کہ اہل باطن کی ریاضت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ لکڑی کو لکڑی سے رگڑیئے تو آگ پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح من و تو کی رگڑ سے عشق کی آگ پیدا ہوتی ہے جو شدید سے شدید تر ہوتی ہے۔ عمق و وسعت میں زمین و آسمان کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ پھر کیا تو اور کیا میں۔ اس کے متعلق کوئی کہے بھی تو کیا کہے۔ جب انا الحق کا مدعی حق ہو چکا تھا تو پھر انا الحق میں انا کی دوئی کیا معنی؟

بابا صاحب کے تیئس سال اسی میں اور تو کی کشمکش میں گزرے۔ اللہ اللہ پورے تیئس سال جبکہ اس قسم کی زندگی کا ہر دن قیامت کے دن سے کم نہیں اور قیامت کا ایک دن دنیا کے ہزار سال کے برابر ہو گا۔ جن پر یہ مصیبت پڑتی ہے۔ وہی جانتے ہیں کہ اس قسم کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر کیسے ہو جاتا ہے۔ اور وہی اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ اس میں نہ کوئی مبالغہ ہے نہ شاعری۔ اس قسم کی زندگی کا ہر سانس ایک شعلہ جوالہ ہوتا ہے اور ہر سانس کی آمد رفت کا سفر سورج کے طلوع و غروب کی طرح ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کا فرمان ہے اُذْکُرُ اللّٰہَ اَشَدّ (شدت سے اللہ کا ذکر کرو) ذکر کسے کہتے ہیں اور شدت کیا ہوتی ہے۔ یہ کوئی سوختہ دل ہی بتا سکتا ہے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ فقیر جب ذکر کی شدت میں مشغول ہوتا ہے تو اس کی سانس سے جلے ہوئے گوشت کی بُو آتی ہے۔ کوئی اپنی ایک انگلی کو جو جسم کا ایک ادنیٰ حصہ ہے ایک منٹ کے لئے بھی معمولی آگ میں ڈال کر یہ حال معلوم کر سکتا ہے کہ جلنا کسے کہتے ہیں۔ اور پھر یہ تو دنیا کی آگ کی بات ہے جو پھیکی آگ ہوتی ہے اور دوزخ کی

آگ کو ستر ہزار دفعہ ٹھنڈا کرنے کے بعد دنیا میں لائی گئی ہے۔ اب اس شدت کو کوئی کیسے بتائے جس کے ساتھ عاشقوں کا ذکر ہوتا ہے اور اُس ریاضت کو کوئی کیسے سمجھائے جو وہ کرتے ہیں۔ ہندو دھرم کی کتابوں میں لکھا ہے کہ وشوامتر نے سولہ ہزار سال تک تپسّیا کی تھی۔ دن اور رات کے پیمانے سے ناپیں تو ممکن ہے کہ سولہ ہی سال گزرے ہوں لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ دل پر اس کیفیت کے سولہ ہزار سال گزرے تو غلط نہ ہوگا۔ دنیا والے کہتے ہیں کہ ہم جو دیکھتے ہیں وہی سچ ہے۔ دین والے کہتے ہیں کہ اصل حقیقت دل کی دنیا ہے۔ باطن کا بھید اہلِ باطن ہی پاسکتے ہیں۔ مٹی کی آنکھوں والا اس کو کیا دیکھے۔

اسی ذکر و فکر کی شدت کے زمانہ میں بابا صاحب قبلہ اکثر صبح کے وقت جنگلوں میں نکل جاتے تھے۔ یہ جنگل موجودہ قیام گاہ کے شرقی جانب ہے۔ اور اس سے کوئی آدھ میل کے فاصلہ پر پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان پہاڑیوں کے پیچھے سات آٹھ میل کے فاصلہ پر سمندر ہے۔ یہ پہاڑیاں بھی بڑی دلچسپ ہیں۔ ان میں گھنے جنگل اور مشکل راستے ہیں۔ جنگلی جانور تو اب کم ہیں مگر سانپوں کا اب بھی وہی حال ہے۔ کافی چڑھائی پر ان ہی پہاڑیوں کے دامن میں ایک عجیب اور دلکش قدرتی جگہ ہے۔ جس کی پشت پر اور دائیں بائیں اونچی پہاڑیاں ہیں اور سامنے یعنی جانبِ شمال دور تک ایک کھلا ہوا میدان۔ اس میدان میں دور تک تاڑ کے درخت ہیں جن پتوں کی چھت ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی حسین سبزہ زار۔ اسی جگہ ایک چٹان پر کوئی تین فٹ اونچا، تین فٹ لمبا، تین فٹ چوڑا بالکل چورس سیاہ پتھر کا ایک مکعب رکھا ہوا ہے جو خوبصورتی میں اپنی نظیر آپ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی سنگتراش نے اپنے فن کی یادگار بنائی ہے۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا جب برسوں بابا صاحب تن تنہا اسی مکعب پتھر پر بیٹھ کر سر بہ زانو اللہ اللہ کیا کرتے تھے۔ خواہ گرمی ہو یا جاڑا۔ دن ہو یا رات عام طور پر سورج جو سمندر کی جانب سے نکلتا اپنی ساری تیزی بابا صاحب کے سر پر صرف کرتا تھا۔ رب ذوالجلال کے کرم کا متحمل ہونے والا ظرف بھی مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ چاندنی راتیں اور ساحلِ سمندر کا چاند کتنا پیارا اور کتنا حسین ہوتا ہے۔ اس نظارہ کا کوئی پاک باطن ہی صحیح اندازہ لگا سکتا ہے۔ یہ چاند بھی طلوع ہوتا اور بابا صاحب پر اپنی محبت و شفقت نچھاور کرتا ہوا مغرب کی گود میں منہ چھپالیتا۔ تاروں بھری راتوں اور سمندر میں ان کا عکس کی جھلملاہٹوں کا دنیا کے قیمتی نگ اور رنگینے بھی ہمسری نہیں کر سکتے۔ یہ حسینانِ فلک رات رات بھر بابا صاحب کی طرف دیکھ دیکھ کر حیرت اور محبت سے اپنی آنکھیں مٹکاتے رہتے۔ جب اندھیری راتیں آئیں تو جنگل میں ایک دہشت ہوتی۔ پھر بھی بابا صاحب اپنے اسی مکعب پتھر پر بیٹھے رہتے۔ اس تاریکی میں کبھی سانپوں کی پھنکار ہوتی کبھی درندوں کی قریب ہی سے چمکتی ہوئی خوفناک آنکھیں۔ کبھی ڈرائونی آوازیں۔ کبھی موت کی سی خاموشی۔ کبھی اس خاموشی میں الّو کی دل ہلا دینے والی چیخ۔ یہ سب تو ظاہر کی دنیا میں تھا۔ لیکن قلبِ عاشق پر جو گزر رہی تھی وہ کون بیان کر سکتا ہے۔ وہ ماحول اور وقت کے اس اتار چڑھائو کے درمیان کس سمندر میں غوطے لگا رہا تھا۔

وہ کون سی لاہوتی فضائوں کو طے کرنے میں مصروف تھا۔ وہ کون سے عالمِ قدس کو اپنا رہا تھا۔ اور پھر دن ہفتے اور مہینے نہیں بلکہ سال اور سالہا سال جبکہ خود اس کا ہر سانس ایک ہزار سال پر بھاری تھا۔ اللہ اللہ فقیروں کے شغل کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔

آج بھی یہ چٹان متبرک مانی جاتی ہے اور زائرین اسے دیکھنے جاتے ہیں۔ اس مکعب پتھر والی چٹان کے سامنے مسجد کے میناروں کی طرح دو تاڑ کے درخت کھڑے ہوئے ہیں جو لوگوں کو دور سے بلاتے ہیں اور بزبانِ حال کہتے ہیں۔ حیّ علا الصّلوٰۃ۔ حیّ علا الفلاح

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں

مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

موجودہ دربار سے مشرق کی طرف کوئی نصف میل کے فاصلہ پر ایک بہت اونچی پہاڑی ہے جس کے نشیب میں ایک چٹان ہے دور سے دیکھئے تو یہ چٹان اپنی ہی سطح پر نظر آتی ہے۔ مگر وہاں پہنچئے تو معلوم ہو گا کہ آپ سطح سے کتنے اونچے ہیں۔ اونچے اونچے درختوں کی چوٹیاں اور دور راجہ کے محلات کی چھتیں اور موجودہ تہذیب کی فیکٹریوں کی چمنیوں سے نکلتا ہوا دھواں۔ یہ سب آپ کو سطح نظر سے بہت نیچے معلوم ہوتے ہیں۔ بابا صاحب اسی زمانہ میں اکثر شام کے وقت اس چٹان پر آکر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ یہاں کا منظر حسین ترین منظر ہے۔ بیس تیس میل تک سامنے کھلا میدان ہے اور س کے آگے کچھ دھندلی دھندلی نیلگوں پہاڑیاں کہیں ریل کے گزرتے ہوئے انجن کا دھواں اور ایک طرف دریا کا بل کھاتے ہوئے بہنا۔ پھر غروبِ آفتاب کا سماں جیسے کسی قوم کے درد رکھنے والے کی غمگین آنکھ جھپک گئی ہو۔

آج کل بھی بابا صاحب ان زائرین کو جن کی قسمت میں کچھ ہوتا ہے لے کر اس چٹان پر سیر کے لئے تشریف لے جاتے ہیں۔ چٹان پر چڑھنے سے پہلے احتراماً لوگ جوتے اتار دیتے ہیں اور اس پر بیٹھ کر خاموشی سے ظاہر و باطن کی سیر کرتے ہیں۔ نامعلوم کیوں دو ایک خادم چٹان کے نیچے آس پاس سے جھاڑ جھنکاڑ فراہم کر کے آگ جلا دیتے ہیں۔ جو خوب بھڑکتی ہے۔ اس چٹان پر بیٹھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حق کی تلاش کی تاریخ۔ خودی کی جستجو کی تاریخ، رمزِ حیات کی تاریخ۔ سب کچھ دل کی دھڑکنوں کی تال پر رقص کرتی ہوئی اپنی آنکھوں کے آگے گزر رہی ہے۔ حضرت آدمؑ کی توبہ۔ حضرت نوحؑ کا طوفان، حضرت زکریا علیہ السلام کا درخت میں سما کر آرہ سے چیرا جانا۔ حضرت یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ کی تاریکی میں لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (کوئی معبود نہیں سوائے تیرے۔ تو پاک ہے میں ظالموں میں سے تھا) کہنا۔ حضرت ابراہیم کا کلمہ حق کی تجدید کرنا۔ حضرت دائودؑ کا لحن اور بالآخر حضرت موسیٰؑ کی رَبِّ اَرِنِیْ کی تکرار۔ یہ سب کچھ آنکھیں نہیں دیکھتیں۔ مگر اس مقام پر بیٹھنے والوں کے قلوب ان

کیفیات کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اس چٹان پر سے اُترتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھڑی کے اعتبار سے تو گھنٹہ بھر گزرا مگر عمر کی تاریخ کے پچاس ہزار سال بیت گئے اللہ اللہ لوگ درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتے ہیں اور خاص وظائف کے چلّے کھینچتے ہیں۔ مگر

من درویش را کشتی بہ غمزہ

کرم کردی الٰہی زندہ باشی

(مجھ درویش کو ادا سے مارا۔ کرم کیا۔ اے الٰہی تو زندہ رہے)

عبودیت کے تقاضے کے مطابق ہر چڑھائی کے بعد بندہ کو اپنے مقام پر لوٹ آنا پڑتا ہے۔ چٹان سے اُترتے ہیں تو بائیں جانب نیچے ایک بہت پرانا اور بہت بڑا راجائوں کا لگایا ہوا آم کا باغ ہے۔ اہلِ چشت کی پرورش آسمانوں کے تلے سورج کے جلال میں گھنے درختوں کے سائے میں ماہ منیر کے جمال میں اور چشموں کے پانی میں ہوتی ہے جہاں وہ اپنے دل کو حجرہ بنا کر ہمہ اوست کے سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں، ظاہر و باطن کی تفریق، دین و دنیا کا تضاد اہلِ چشت سب کچھ ایک گھونٹ میں پی جاتے ہیں۔ باغ کی سیر کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر درخت کی ایک تاریخ ہے اور اس کی بھی ایک آپ بیتی، ایک جان، ایک دل، ایک روح ہے۔ اور وہ زبانِ حال سے کچھ کہہ رہے ہیں۔ مگر ہم سُن نہیں سکتے۔ پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پتہ پتہ ذکرِ حق میں لگا ہوا ہے۔ باغ کے نشیب میں ایک کنواں ہے اس سے پانی لیا جاتا ہے۔ لوگ منہ ہاتھ دھو کر تھکن دور کرتے ہیں۔ باغ کی مالن بابا صاحب کے لئے گائے کے تازہ دودھ میں شکر ملا کر چاندی کے گلاس میں پیش کرتی ہے۔ بابا صاحب گلاس سے منہ لگاتے ہیں۔ آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوتی ہیں اور دو ایک گھونٹ پینے کے بعد جو بھی پاس ہوتا ہے۔ اس کو بخش دیتے ہیں اور قیام گاہ پر لوٹ جاتے ہیں۔

آپ کا حجرہ ایک نشانی ہے۔ ایک دل ہے جس میں حق بستا ہے۔ ماسوا کا یہاں دخل نہیں اور عود کی خوشبو ایک نشانی ہے۔ فیضِ محبت کے رُوپ کی۔ یہاں شک و شبہ کی گنجائش نہیں یہاں تجلیاں اور کبریائی کارفرما ہیں۔ خودی کیسی، خواہشات کیسی، اپنی کوشش کیسی۔ اپنی صلاحیتیں کیا۔ اپنی دینی طلب اور آرزو کیا۔ یہ سب کچھ ہیچ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس نے حجرۂ مبارک میں قدم رکھا ہے وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي۔

(اے نفسِ مطمنہ رجوع ہو اپنے رب کی طرف راضی ہونے والا (رب سے) اور (رب کی) رضا حاصل کئے ہوئے۔ پھر داخل ہو اس کے بندوں میں اور داخل ہو جنت میں)

نفسِ مطمئنہ تصوت کی آخری منزل ہے۔ اس کے بعد مقامِ عبودیت میں داخل ہوتے ہیں اور ''میری جنت'' میں داخل ہونے کے قابل ہوتے ہیں۔

میں ہوں کہاں تم ہی تم ہو روحِ رواں و جانِ من
بوئے صفات ہو تم ہی جلوۂ شانِ ذُوالمنن

نازشِ بندگی ہو تم تابشِ زندگی ہو تم
عینِ یقین تم ہی تو ہو سِرِ نہانِ جانِ من

اسم کی اوٹ خوب لی، خوب ہوئی یہ گفتگو
لطفِ کلام تم سے ہے تم ہی ہو معنیٔ سُخن

کیف ہے وجہ درد و شوق کیف ظہورِ کائنات
نغمہ سرا تم ہی تو ہو، صحن صحن، چمن چمن

سوزِ دروں ہو گئی بندشِ روح و قلب و تن
فرقت و بے کلی بنی، صبر و قرار جانِ من

دامِ وجود بن گیا حلقہ زُلفِ پُر شکن
دام میں اپنے آ گیا عشوہ طرازِ پُر فتن

اَنْفُسُکُمْ جو کہہ دیا بات عجب سی بن گی
میں ہوں کہاں تم ہی تو ہو بشکلِ ولیؔ منّ و عن

(ولیؔ الدین)

ساجن کا تصور چھایا ہے پُر نور شراب برستی ہے

اب خواہشِ مینا کون کرے بے جام سرور و مستی ہے

من گیان کی نیاری نگری میں گر دھیان کا نیارا چاند اُبھرا

اس سیلِ نور کی موجوں سے اب شغلِ مے پرستی ہے

کچھ سندر سندر سپنے ہیں کچھ پیاری پیاری باتیں ہیں

وہ جلوے ہیں جن جلووں کو زاہد کی آنکھ ترستی ہے

آغاز نہیں انجام نہیں، یاں تن کا من سے کام نہیں

یاں من موہن کا سایہ ہے، ناموت یہاں ناہستی ہے

سب دُکھ کی باتیں بھول گئیں سب سکھ شوالے ٹوٹ گئے

ایک تیرے نام کی پوجا سے، یہ دل کی بستی بستی ہے

(رحمن بابا)

☆...☆...☆